ہمچو ادھم بحرِ حق بایک پیالہ جستہ اَم　　مثلِ قرنی دُرِّ دیگر را تلاشے کردہ اَم

در شبیہم بر دیارت نسبتے آوردہ اَم　　بہر اُمت تحفہ نورِ جمالت بُردہ اَم

# دُرِ عینی

## حیات قبلہ باباعبید اللہ دُرانی مدظلہ العالیٰ

باب ۶

# قادر نگر (وزیام نگر) جنوبی ہند

علی گڑھ کے قیام کے دوران جو ریڑھ کی ہڈیاں گلیں اور پلاسٹر جسم سے باندھ دیا گیا تو ۱۹۴۸ء میں وطن واپس جانا پڑا۔ ۲۶ء میں بابا تاج الدینؒ پردہ فرما چکے تھے۔ پورے تئیس سال اس جدائی میں قبلہ کے گزرے تھے اور اب حالت یہ تھی کہ جیسے اپنی بھی دنیا سے روانگی کا زمانہ قریب آرہا ہو۔ اپنے اعزا سے سنا تھا کہ وزیام نگر میں بابا تاج الدینؒ کے ایک خلیفہ بزرگ بابا قادر اولیاءؒ ہیں۔ دل نے پکارا کہ دنیا سے رخصت ہوتے ہو، چلو ایک اچھے بزرگ کی شکل دیکھ کر رخصت ہوں۔ جسم پلاسٹر میں بندھا اسٹریچر پر ڈال کر قادر نگر، وزیام نگر پہنچائے گئے۔ شام کا وقت تھا۔ صحن میں اسٹریچر رکھا تھا۔ بابا قادر اولیاءؒ تشریف لائے۔ پہلی نظر دیکھ کر ارشاد ہوا ایک مسافر بڑے شاندار جہاز پر جارہا تھا اس جہاز کو آخر غروب ہونا ہی تھا وہ غروب ہو گیا۔ یہ بیمار مسافر ایک تختہ پر، بھوکا پیاسا موجوں کے تھپیڑے کھاتا رہا۔ پھر ایک اور جہاز نے اسے آکر اٹھالیا۔ قبلہ نے بعد میں اس بات پر غور کیا تو خیال آیا کہ تاج باباؒ سے جدا ہوئے ٹھیک تئیس سال گزرے تھے۔

پھر قبلہ سے خصوصی مخاطب ہو کر فرمایا۔ انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ ٹی بی کے چھوٹے چھوٹے کیڑے اس اشرف کو کیسے کھا جاتے ہیں (قبلہ کو کئی قسم کی ٹی بی پہلے ہو چکی تھی)۔ پھر بابا جان نے فرمایا "دیکھو بڑا کیڑا سب چھوٹے کیڑوں کو کھا جاتا ہے یہ بڑا کیڑا غمِ عشق ہوتا ہے۔" اس طرح غم عشق کے سہارے، حیاتِ نو کی بشارت دینے کے بعد بابا جان نے بڑے پیار سے فرمایا "رات ہو رہی ہے۔ اِدھر ہی ستالو، کل دیکھا جائے گا۔ اس طرح ایک ایک دن کر کے بڑی شفقت سے روکتے رہے اور اس محبت و رحمت کے دامن میں اس جسم نحیف کے پورے نو ماہ اودھر گزرے نہ علاج نہ معالجہ بس آتے جاتے ایک محبت کی بات ایک شفقت کی نگاہ۔ پھر اسی قیام کے دوران تقریباً چھ ماہ بعد ایک دن بابا خان نے بڑے بھولے پن سے پوچھا کہ یہ پلاسٹر سا کیا ہے جی۔ پھر آری منگوا کر یہ پلاسٹر کٹوا دیا گیا اور بعد میں عزیزوں نے اس کی جگہ موٹے چمڑے کی ایک مضبوط کاٹھی سی قبضہ دار بنوا دی تا کہ ریڑھ کی ہڈی اور جسم کو سہارا دیئے رہے۔ اس کاٹھی کے اوپر سے قمیض پہن لی جاتی۔ (یہ کاٹھی قبلہ نے تقریباً سات سال تک استعمال کی اور س وقت بھی استعمال ہوتی تھی جب پشاور میں ۵۴ء میں انجینئرنگ کالج کی ملازمت اختیار کی)۔ رفتہ رفتہ بابا جان نے اپنی معیت میں قبلہ کو بٹھانا شروع کرا دیا اور پھر کھڑا کر کے ٹہلانا۔ پھر وہ بھی دن آئے کہ بابا جان جب جنگل کی سیر کو نکلتے تو قبلہ درانی صاحب کو بھی ساتھ لے جاتے۔ اس زمانہ میں قبلہ پر ایک جذب کا سا عالم طاری رہتا۔ ان جنگل کی سیروں اور پہاڑوں کی منزلوں میں، روح کی منازل طے کرائی جاتیں جذب کے عالم میں سیر کی حقیقت کا انکشاف ہوتا رہتا۔ بشارتوں میں یا جھلکیوں میں اس روحانی سیر اور منازل ارتقاء کی داستان تو لمبی ہے۔ مختصراً یہ کہ جمادی حالت، نباتی حالت اور حیوانی حالت سے روح کا ارتقاء ہو کر پھر کہیں انسان کی حالت نصیب ہوتی ہے۔ اس کا ذکر مولانا رومؒ نے بھی اپنی مثنوی میں کیا ہے کہ جمادی سے مرا تو بناتی ہوا۔ بناتی سے مرا تو حیواں ہوا، اور انسان بنا تو اب فرشتوں کے بال و پر بھی نوچ لوں گا کیونکہ میری منزل الیہ راجعون ہے۔ قبلہ نے اپنے کو پہلے مرغ پھر بکری، پھر سانبھر، پھر عقاب کی کیفیت میں دیکھا۔ دو ایک دفعہ یہ بھی ہوا کہ لیٹے ہیں تو ساتھ ہی ایک خوبصورت گائے کا چہرہ ہے۔ رسولؐ اللہ کے چند ساتھیوں کو بھی گائے کہا گیا ہے۔ یہ لوگ کرشن کے مقام کے ہوتے ہیں۔ پھر وہ بھی دن آیا جب اپنے مقابل اپنا جیسا ہی ایک اور دیکھا۔ یہ تمیز کرنا

بھی مشکل تھا کہ کون کون ہے۔ منزلِ آدم پر پہنچ کر پھر ارتقائے روحانی کی وہ منازل بھی طے ہوئیں جس میں آدمؑ سے لے کر نبی کریمؐ کے مقام تک پہنچنے کے لئے تمام انبیاء کی منازل سے گزرنا ہوتا ہے۔ ارتقائے روحانی کی ان منازل کا حال قبلہ درانی صاحب نے اپنی کتاب وِدر اِی سادھو میں استعارات اور کنایوں میں بیان کیا ہے اس کا ایک مختصر سا حال حیاتِ قادر میں بھی ارتقائے باطن کے مضمون میں درج ہے۔ کتابی صورت میں آنے سے قبل یہ چھوٹے چھوٹے پُرزوں پر تحریر تھی جن کو حسن اختر صاحب نے علی گڑھ میں یکجا کرنے کی کوشش کی۔ پھر قبلہ نے ایک دو نشست میں ڈکیٹلٹ کرا دی۔ ودرای سادھو کا تلگو ترجمہ کلکتہ والے ڈاکٹر رائو نے کیا۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر رائو نے قبلہ کو اس وقت سنایا جب ۵۸ء میں وہ پاکستان سے بابا قادر اولیاءؒ کے دربار پہنچے تھے۔ ڈاکٹر رائو نے خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ بھی ایک الہامی کتاب ہے۔ چالیس صفحوں میں روح کی ساری واردات لکھ دی ہے۔ دربار کے متعلق اس کا کہنا تھا کہ یہ خاص شہنشاہی اور دین کا وقت ہوتا ہے جوش ہوتا ہے اور رحمت بے تاب ہوتی ہے۔ بابا جان کا ارشاد ڈاکٹر رائو نے سنایا کہ جو لوگ لائن میں حاضری دینے آتے ہیں ان کے لئے فیض اور جو اُدھر سیدھی طرف ہوتے ہیں وہ عزت کے لئے۔

قادر نگر، وجیا نگرم، جنوبی ہند کے اس قیام کے دوران جو کافی طویل تھا، قبلہ کے فقر کو چار چاند لگے۔ بابا تاج الدینؒ کے وصال کے بعد جو تنہا سفر ہو رہا تھا یا ایک ڈوبے ہوئے جہاز کا مسافر، سمندر میں ایک تختہ پر تھپیڑے کھا رہا تھا اس کو ایک اور بڑے بحری جہاز نے اٹھا کر سوار کر لیا اور روحانی ارتقاء بحر حقیقت کا سفر پھر سے شروع ہوا۔ کتاب ودرای سادھو اور حیاتِ قادر میں اس کی جھلکیاں مکمل انداز میں موجود ہیں۔ قادر نگر دربار میں فیض کے جو ظاہر میں نقشے چل رہے تھے ان کی کچھ جھلک جشن کے ایام کے بیان میں قبلہ نے پیش کی ہے۔ جشن کے ایام میں بے پناہ ہجوم خلقت کا ہوتا ہے۔ ان میں بیشتر وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے ایک بار حضور کو دیکھا تھا اور پھر اسی دن سے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ کیسی پیری، کیسی مریدی۔ عشق میں نہ ذات پات نہ ایمان دھرم کا فرق۔ ہر جشن گزشتہ جشن کی تصویر، وجود کائنات میں ایک اچھوتا خوش نما منظر، آماجگاہِ خلائق، اس لئے کہ تمام کائنات کے دل کا مرکز خلق میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔ صبح صادق سے ہی لوگ یادِ الٰہی میں مشغول۔ دربار میں حمد و تسبیح قرآن خوانی، یہ حریم ناز میں قرآن پڑھنا، دراصل حریم دل میں ہی صدا دینے والی بات ہے۔ باہر شہنائی کی سُریلی آواز۔ بینڈ پر یا شفیع الوراء سلامٌ علیک۔ بابا جان کی تشریف آوری۔ بُوئے حبیب سے رُوح معطر۔ جلوۂ محمدؐی کی رونمائی آئینہ دار دلوں میں اپنے اپنے نصیب کے مطابق ہو جاتی ہے۔

بابا جان کے تخت پر قبلہ رُخ جلوہ افروز ہونے کے بعد قطار در قطار خلقت کا ہجوم پھول، ہار، عطر کی آڑ لے کر اپنے جان و دل نثار کرنے شروع کر دیتا ہے۔ دیدار سے جیسے ایک عرصہ کی دبی ہوئی آرزو پوری ہوتی ہے۔ قوالی، آرتھی، بھجن، ناچ، بینڈ، شہنائی سب کچھ ساتھ ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ یہ ہوتی ہے حق کی شان کہ یہ سب کچھ محبت کا ایک ہی ساز، ایک ہی لے، ایک ہی سُر معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان سب کے پیچھے دل ہوتا ہے۔ ایک ہی رُخ، رجوع الی اللہ۔ قبلہ نے بابا جان کے کرم سے بارہا بھی یہ دیکھا کہ بہت سے ایسے لوگوں کی بھی حاضری ہوتی جاتی ہے جو وہاں جسمانی طور پر موجود نہیں۔ اور ارواح، ملائک، اجناسب ہی ان دنیاوی لوگوں کی قطار کے ساتھ دوسرے طبق میں گزرتے جاتے ہیں۔ گویا جہان کے نقشے چلنے کے ساتھ ساتھ کائنات کا بھی نقشہ کُھلتا جاتا ہے۔ خصوصی حاضریوں کے دوران بابا جان قبلہ نے جو فرمایا اس کو دکھا بھی دیا۔ فرمایا مالک کے کارن ہیں۔ ساری مخلوق اور ملائک سر جھکاتے ہیں۔ لوگ ہی نہیں، روحیں اور ساری مخلوق چکر لگاتی ہے۔ ہمیں کسی وقت فرصت نہیں۔ ہر ایک کو حاضری دینی ہوتی ہے۔ مگر بوجھ ضعیفی میں بھی اس بدن پر پڑتا ہے۔ مٹی کے پتلے کو نہیں چھوڑتے۔ مٹی کا ڈھیر بھی ہو گیا تب بھی یہی کریں گے۔ پڑھے لکھے لوگ سمجھ کر زیادہ آئیں گے۔ یہ وجے نگرم بھی ایک آباد شہر ہو جائے گا۔ مٹّی (قادر نگر) سے سڑک بھی پکی بن جائے گی۔ اس کے دونوں طرف مکان اور دکانیں ہوں

گی۔ بابا کی شان ہے ہر طرف سے لوگ آئیں گے۔ مٹی کے ڈھیر کو بھی نہ چھوڑیں گے۔ ہم چودہ سال کی عمر سے اب ساٹھ سال کی عمر تک یہاں بیٹھے ہیں۔ کبھی کوئی نامراد واپس نہیں گیا۔ جو آیا بامراد رہا۔ ہمیں کیا سننے کی ضرورت ہے۔ خدا نے ہمیں طاقت دی ہے۔ خدا بھی اکثر بندے کے روپ میں آجاتا ہے یہ حق الحق کی شان ہے ہم سب لکھا مٹا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں یوں نہیں یوں ہو، تو ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ قبر میں اگر ہمارا نام لے دیں تو ملائک دور ہو جاتے ہیں۔ پیران پیر کا شعر ہے۔

گر نکیر آید و پُرسد کہ بگو ربِّ تو کیست

گویم آنکس کہ ربود ایں دل دیوانہ ما

بظاہر یہ الفاظ خود ستائی کی سی بات معلوم ہوتے ہیں مگر جس نے خود آگہی کی مستی دیکھی ہو۔ وہ اس حقیقت کلام سے آشنا ہو سکتا ہے۔ ان الفاظ پر ایمان اور ان کی قدر وہی قلوب کر سکتے ہیں۔ جنہیں کسی حق الحق کی شان والے کے سامنے حاضری نصیب ہوئی ہو قادر نگر دربار کے قیام کے دوران کرم کا احساس اس طرح ہوتا ہے کہ ہر چیز ہوتی جاتی ہے اور ہر صورت بظاہر اتفاقیہ طور پر ظہور میں آتی ہے۔ ہر قسم کی دشواری خود بخود آسانی کی صورت میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ اور قادر نگر کی سرزمین پر بابا کے سایہ کانہ صرف اطمینان بلکہ یقین ہر کسی کو وسوسوں، وہموں اور موت وحیات کے بندھنوں سے نجات دلاتا ہے۔ قادر نگر کے قیام کے دوران ایک سحر کی سی کیفیت بیشتر حصہ قیام میں قبلہ پر گزرتی رہی۔ قبلہ کا فرمانا ہے کہ ایک کیف کی دنیا میں قیام رہا اور یقین اپنے مالک کی خود مختاری پر اور بڑھتا گیا کیونکہ بابا جان کا فرمانا ہے۔ میری بکریوں کے لئے جب ملک الموت آتا ہے تو چالیس قدم دور کھڑا رہ کر میری اجازت چاہتا ہے تب کہیں میری بکری لے جا سکتا ہے۔ قادر نگر میں رہنے کے بعد تو ہر شخص موت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ کوئی مر بھی جائے تو رنج نہیں کرتے بلکہ مطمئن ہوتے ہیں کہ یہاں کی مٹی مل گئی۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ تو یہ ہوا ہے کہ انہیں موت سے پہلے ہی یہاں سے روانہ کر دیا گیا ہے۔ کسی کسی کو ہی یہ مٹی نصیب ہوئی ہے۔ انجام کا ہر ایک کو اتنا یقین ہوتا ہے کہ بغیر بابا کے حکم کے یہاں کچھ نہیں ہوتا اور مطمئن نظر آتے ہیں۔ قادر نگر میں چند دن کا قیام ہی توکل کا ٹھوس ستون بن جاتا ہے۔ کیسی آرزو، کیسی تمنائیں۔ علیم و خبیر فیق و رحیم کے سامنے یہ سب غیر ضروری باتیں ہوتی ہیں اور پھر جو دل سراپا انہماک ہوں وہاں آرزوئوں اور تمنائوں کی گنجائش کہاں۔

جشن کے دوران کچھ وقفہ کے لئے بابا جان دربار کے ساتھ ہی حجرۂ مبارک میں تشریف لے جاتے ہیں اور ایک تخت پر لگے ہوئے مُصلے پر قبلہ رُخ بیٹھتے ہیں۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حق خود حریم ناز میں جلوہ افراز ہے اور وہاں ارواح کو حاضری دینا مقصود ہوتی ہے۔ چند بار قبلہ کی خوش نصیبی تھی کہ اندر بلا لئے گئے۔ قبلہ کا فرمانا ہے کہ وہاں وتُعِزُّ من تشاء وتُذِلُّ من تشاء کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ دربار کی شان کس انداز میں بیان کی جائے۔ دنیا نے شان، درمیان عبد و معبود، درمیان طالب و مطلوب کب دیکھی ہو گی۔ خود بابا جان نے کسی سے دریافت کیا۔ یہ فقیری دربارے کہ امیری۔ کیا دوسری جگہوں میں ایسا ہوتا ہے۔ یہ مالک کی شان ہے۔ دوپہر لنگر سے غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ بھوکے کا پیٹ بھرانا بابا جان کو تمام باتوں سے زیادہ پسند ہے اس لئے کہ بھوکے کا پیٹ بھر جانا عین دعا کے مترادف ہے۔ اس کے لئے کسی الفاظ کی گنجائش نہیں۔ الفاظ تو انسان غلط بول سکتا ہے مگر بھرے ہوئے پیٹ کی گواہی سب سے بڑی گواہی ہے لنگر خانہ کیا ہے۔ ربوبیت کی شان کا مظہر۔ ایک دیگ پکائو یا دس دیگ۔ کھانے والے بھی موجود ہو جاتے ہیں یہ فکر نہیں ہوتی کہ کون کھائے گا اور کھانا کم ہو تب بھی سب کو کافی۔ ایک دفعہ لکڑی گیلی تھی، بابا جان سے عرض کیا گیا فرمایا

پانی ڈال دو۔ ایمان والوں نے ایسا ہی کیا اور آگ پٹرول کی طرح بھڑک اٹھی۔ اسی طرح ایک دفعہ گھی کم تھا تو فرمایا مٹی کا تیل موجود ہے وہ ڈال دو۔ قربان جائیں فدائیوں کے ایمان کے کہ انہوں نے بغیر وہم وشک کے ایسا ہی کیا اور ذائقہ دار پلاؤ مٹی کے تیل سے ہی پکالیا۔ خوش نصیب ہیں وہ جنہیں اس لنگر خانے سے تبرک ملے۔ یہ اپنے جوشِ ایمان پر منحصر ہوتا ہے کہ انعام واکرام سے کتنا فیض کوئی حاصل کرے۔ قبلہ کا فرمانا ہے کہ جس نے بہ طیب قلب اس لنگر خانے سے کھایا وہ ولی ہوا۔ انسان تو انسان، ایسا نظر آتا ہے کہ اجنا اور ارواح بھی اس لنگر خانے سے تبرک حاصل کرے اس جشن کے دن آتے ہیں۔ خوش نصیب تر ہیں وہ خادم جو لنگر پکانے کی محنت بھی کرتے ہیں اور لوگوں کا برا بھلا بھی صبر سے سن لیتے ہیں۔ لیکن زیادتی کرنے والوں کی پکڑ بھی خود بخود ہو جاتی ہے۔ لنگر خانہ کی صرف ایک ہی خادمہ کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ جب قادر نگر سے دوران کے انتقال کا وقت آیا تو فرماتی تھیں ''ہٹو۔ بابا جان تشریف لائے ہیں، خوشبوئیں آرہی ہیں۔ مجھے اچھے کپڑے پہنائے جارہے ہیں۔''

دربار کا نقشہ ایک دنیا کا نقشہ سمجھ لیں۔ ہر قسم کے لوگ امیر غریب، چھوٹے بڑے سب ایک ہی دُھن میں مشغول، دل کی طہارت، یاد الٰہی، دکھاوے کی سب چیزیں بیکار۔ مساواتِ مسکینی اور توکل کا سبق انسان کو ملتا ہے۔ جو کام سپرد ہے اس کو انہماک سے کرتے رہنا ہی عبادت ہے۔ یہاں سب اونچ نیچ انسان کے ظاہر باطن کی ہموار کر دی جاتی ہے۔ دریا کی حدود میں اللہ اللہ کرتے رہنا اور سینہ کو منور رکھنا ہی باطن کے سنوارنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایمان محبت کا نام ہے۔ ایمان کی لذت وہی قلب جان سکتے ہیں جن کو محبت کسی مظہر کی طرف رجوع ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ ایسی معصومیت میں وہ اپنی صداقت قلب کے خود گواہ ہوتے ہیں اور سب سے سچی شہادت سوائے اپنے اندرون قلب کے اور کون دے سکتا ہے۔ اشھد ان لا الہٰ الا اللہ زبان سے کیا کہنا۔ جب تک کہ رواں رواں گواہی نہ دے اور دل کی گواہی کب رد ہو سکتی ہے۔

اسی ذکر کی شدت میں تیسری آنکھ جو نقشے ساتھ ساتھ دیکھ رہی تھی ان کو بیان میں لانا بھی دشوار ہے۔ ذاتِ لامتناہی محیط ہے زمان مکان کی حدیں ٹوٹ چکی ہیں ازل ابد کی حدوں میں عشق وحُسن کی داستان دہرائی جارہی ہے۔ محبوب کی رضا حاصل کر کے جلوس مظہر حق کی طرف واپس آرہا ہے۔ یہ شام کا وقت ہے، صبح کو یہ جلوس محبوب کے گھر کی جانب روانہ ہوا تھا اور اب واپسی ہو رہی ہے۔ فضائیں محبت کے نغموں سے پُر ہیں گروہ در گروہ مخلوق نظر آرہی ہے۔ گانے، ڈھول، کرتب، جھنڈے، آتشبازی، گولے غرض سب کچھ اس لطافتوں کی سطح پر بھی ہو رہا ہے۔ مادی سطح کو بھی اس لطافتوں کی سطح نے ڈھانک رکھا ہے۔ مادی اور لطافتوں کی سطح کا سارے کا سارا منظر ایک ہی توحیدی یکتائیت میں ہے۔ وہ دور سے سفید ہاتھی بھی نظر آرہا ہے۔ سنہری عماری میں تین بزرگ ایک ہی قطار میں بیٹھے ہیں۔ یہ ابدال ہیں، سیدھے ہاتھ میں چاندی کے گلاس لئے ہیں اور بائیں ہاتھ سے ان گلاسوں کو ڈھانک رکھا ہے۔ جلوس صاحب وقت دولہا کے گھر پہنچا۔ سفید ہاتھی گھٹنوں کے بل جھکا سونڈ اٹھا کر نہایت احترام سے دولہا کو سلام کیا۔ کرتب بازوں نے زبردست جوش میں آکر کرتب دکھانے شروع کئے۔ ڈھول اور شدت سے بجے۔ دولہا کو تدریں شروع ہوئیں۔ پھول ہی پھول، اتنا ڈھیر کہ ہاتھی بھی ڈھک جائے۔ رنگ برنگ کپڑے، موسم بے موسم کے پھل، سبزیاں، اناج، مصالحے چھکڑوں پر لدے ہوئے نیاز کے جانور، خلقت کھائے، سیر اب ہو۔ کھیل تماشے، آتش بازی، ڈھول نقارے، نیزوں تلواروں کے کرتب سب کچھ دولہا کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے ہو رہے ہیں۔ قطب، ابدال، اوتار، آمرین حق، ارواحِ مقدسہ دولہا کے آگے اپنی اپنی نیاز مندی پیش کرتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ دولہا صاحب وقت ان کھیل تماشوں، نیاز مندیوں کو بھی لطف اندوز ہو کر نبھا رہا ہے اور ساتھ ساتھ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہے۔ نگاہیں کہیں دور، آسمانوں میں، وسعتوں میں سمائی ہوئی۔ اپنا وجود ساری کائنات کا دل بنا ہوا۔ سب کچھ اپنے میں سمیٹے ہوئے، ایک مستیٔ ہشیار کی حالت میں، یہ آگہی کی مستی ہے۔ جسم، قلب، روح،

صفات، ذات سب سطحوں پر محیط ہے۔ اب رات کا وقت ہو چکا ہے اور آہستہ آہستہ ڈھول، گانے، ساز سب بند ہوتے چلے گئے۔ قبلہ کے لئے ایک بڑی خوشیوں کا دن گزرا، مگر ساتھ ہی ایک اداسی سی اپنے اندر چھا گئی۔ جس آنکھ نے دوسرے عالم میں یہ سب کچھ دیکھا اس کو بھی شب ہجر کے غلافوں نے پھر سے ڈھانک لیا۔ مگر وہ دربار کے ایک کونے میں رفعی فقیروں کا دف پر ذکرِ جلی شروع ہوا۔ ان کی چمکدار آنکھیں، لانبے لانبے بکھرے بال دف پر، بدن کو شدت سے گھماناز نجیروں کی کھڑک، مستی میں شدت آنا۔ لا الہٰ پر لانبے بالوں کا جھٹکے سے ہلنا الا اللہ پر آنکھوں میں مشعل جیسی چمک آجانا۔ سننے والے کے دل پر ہر دف کی دھاپ پر خنجر کی سی چوٹ لگنا۔ اس ذکر جلی کی شدت میں لا الہ الا اللہ کے ایک ایک حرف کا دل میں ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگنا۔ جیسے دل کچلا جارہا ہو، ملا جارہا ہو۔ گھبرا کر نکلنا چاہا تو بھی ناممکن۔ جیسے اس ذکر نے احاطہ کر لیا ہو۔ روح نے اس ذکر کی وسعتوں میں اپنی وسعت کو پالیا ہو۔ اُدھر ان فقیروں کی تھاپ تیز ہوئی۔ ذکر تیز ہوا اور ادھر یہ حالت قبلہ کی ہوئی کہ سانس کے لئے تڑپنے لگے۔ رونا چاہا تو آنسو خشک، زبان اور گلے میں وہ خشکی کہ الامان جیسے زندہ جسم، پورا کا پورا آگ میں پھینک دیا گیا ہو۔ جسم جھلس رہا ہو، گوشت بھن رہا ہو، ہڈیاں تڑخ رہی ہوں۔ رگ، ریشہ، آنتیں غرض سب کچھ جلتی ہوئی لکڑیوں کی طرح ہو گیا ہو۔ اس آگ کی شدت کو کیسے بیان کیا جائے۔ یہ فنا کی آگ ہے بغیر کرم کے یہ نصیب کہاں ہوتی ہے اور بابا جان کا کرم ہی تھا کہ قبلہ اس شدتِ آتش شوق میں بیہوش ہو گئے۔ صبح آنکھ کھلی تو میٹھی میٹھی سُہانی، شہنائی کی آواز ایسی آ رہی تھی کہ جیسے عدم کے سرے سے نئی زندگی نے جنم لیا ہو۔ جسم گویا ایک کھوکھلی بانسری کی طرح ہو چکا تھا۔ سانس بھی نئی اور جیسے نئی روح بدن میں پھونک دی گئی ہو۔ یہ لا الہ کی فنا کے بعد الا اللہ کا ظہور ہے۔ اسی لئے فقیر کلمہ پڑھتا نہیں بلکہ ہو جاتا ہے لا الہٰ کی فنا کی آگ سے گزر کر دیکھیں تب ہی لا الہٰ کی فہم اور عرفان ہوتا ہے۔ اسی حالت میں کوئی حق کا فرستادہ قبلہ کے لئے شربت کا گلاس لایا۔ اور دعوت کے لئے بلا کر لے چلا۔ راستے میں قبلہ نے دیکھا کہ برگد کے نیچے سفید ہاتھی کھڑا ہے۔ اس کی مخمور آنکھوں میں ایسی کشش تھی کہ اس کی طرف کھنچے چلے گئے۔ یہ آنکھیں جیسے محبت والی عورت کی آنسو بھری آنکھیں۔ غزال کی شرمیلی آنکھیں، نرگس کے پھول کی آنسو بھری آنکھیں۔ ان آنکھوں کی شراب کیا بیان کی جائے۔ اس میں غم ہے لیکن رنج نہیں۔ اس میں یاد ہے لیکن افسوس نہیں۔ اس میں امید ہے لیکن محل بنانے کے خواب نہیں۔ اس میں سکون ہے لیکن نیند نہیں۔ اس میں عقلمندی ہے جو ذہانت سے اوپر کی بات ہے اس میں سمجھ بوجھ سے جو دلیلوں سے بلند سطح کی چیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سفید ہاتھی، روحانی سواری کو دولہا کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ جب کبھی اپنی جائے قیام سے باہر جائے تو اس پر سواری کرے یہ روح، اور روح کی سواری لطافتوں کی دنیا کی باتیں ہیں۔ نبی کریمؐ نے بھی لطافتوں کی دنیا میں تین چیزیں پسند فرمائی تھیں۔ عورت گویا عکس رخسار، جمالِ ذات، غار گویا دیدار، معراج مازاغ البصر، آنکھوں کی ٹھنڈک اور خوشبو گویا روح کی سواری۔ عالم بالا سے عالم وجود کی طرف رابطہ۔ اسی لئے نیازوں اور مزارات وغیرہ پر خوشبوئوں کا رواج ہے مگر جسم کی قید میں ہوتے ہوئے روحانی سفر کسی دوسری سطح کی بات ہے۔ جسم میں جب تک لطافت روح نہ آجائے، معراج میں کیسے ساتھ دے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ کیسے پہنچے۔ اپنی ہی روحانی سواری پر اس سفر عروج پر روانہ ہوا جاتا ہے۔ جیسے بُراق، برق رفتار پر لمحوں میں سیر آفاق ہوئی اسی طرح دوسری روحانی سواریوں کی اپنے اپنے مقام کی بات ہے۔ ہاتھی کا یقین اور بھروسے والا قدم۔ ارتقاء کی منزل چال، جھاڑ جھنکار کو راستے سے ہٹاتا ہوا، زمین وجود پر شاہانہ سفر۔

یہ سب کچھ تو ایک معمولی سی جھلکی ہی ہے اس نظارہ کی جو روح کی کھڑکی کھلنے کی صورت میں قبلہ کو نظر آرہا تھا۔ یوں تو قدرنگر اور وہاں کے ایام سب کے سب ایک پُرخلوص اور باصفا زندگی کا نمونہ پیش کر رہے تھے جسے مادی سطح پر روزمرہ زندگی ہی کہہ لیں۔ مگر اس تمام کے پیچھے ایک دل

ہزار دل کا نقشہ کار فرما تھا۔ محبت ہی محبت، عشق ہی عشق کا ہر طرف چرچا تھا۔ ہر چیز، اپنا سب کچھ محبوب اور محبوب والوں پر نثار اور اس سے اور اوپر روح کی سطح پر، عالم انسانی کے لئے منزلِ یقین کی راہ کشادہ کر دی گئی تھی۔ یہ سب کچھ اسی لئے تو تھا کہ بابا قادر اولیاءؒ کے وردو سے قادر نگر، مرکز قلب کائنات بن گیا تھا۔ نہ یہ تفصیلات زیب داستان بنائی جاسکتی ہیں نہ تحریر کے محدود دائرے میں ان وسعتوں کو سمیٹا جاسکتا ہے۔

اس خلافت ارضی کا سلسلہ کچھ اسی اندازِ رحمت میں ہے کہ رحمت للعالمینی انوار کی تجلی جہاں ذرہ ذرہ دے رہا ہے وہاں کوئی وجودِ مطہر اکملیت کا انداز لئے، صاحب وقت کی حیثیت سے اس رحمت کے نشر کا ذریعہ بنا ہوتا ہے۔ نور محمدی کا سلسلہ جاری و ساری ہے اور یہ امانت اس طرح وجود در وجود منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اسی نور کے طفیل، خلقت کا رجوع اُس وجود گرامی کی جانب لازمی سا ہوتا ہے۔ جہاں یہ مرکزیت سمٹ کر گویا کائنات کا دل بن جاتی ہے۔ رحمت کے اس مجسمۂ نور کے گرد تمام انوار چکر لگاتے ہیں۔ کیا ارواح مقدسہ کیا ملائک، کیونکہ نور محمدی کی تابانی ایک ہی وحدت الوجود کے انوار میں محیط ہے۔ اس میں نہ کمی بیشی، نہ نور کی تقسیم، نورٌ علیٰ نور۔

اب روح کی سواری کی بات یہ ہے کہ جیسے جسم کی سواری کے لئے جانور یا مشین جیسے موٹر، ریل، ہوائی جہاز، جسم کو بہت کم حرکت دیئے بغیر سوار کے تصرف میں ہی کوئی سفر پورا کرا دیتے ہیں۔ اسی طرح روح کی سواری اپنے سوار کے تصرف میں ہوتی ہے۔ روح تو خیال سے بھی الطف در الطف، عالم امر کی بات ہے۔ اس لئے آن واحد میں کہیں سے کہیں جیسے برق رفتار رف رف۔ اس سیر فی الارض، سیر افلاک، سیر انفس، سیر آفاق کی لطافتیں سپردِ تحریر کیسے ہوں۔ جیسے جسم نشانی ہے اپنے صانع حقیقی کے کمالِ حُسن کی۔ اسی طرح روح اور روحانی سواری نشانیاں ہیں امر ربی کے اجراء کی۔

یہ باتیں عقل کی دسترس میں کیسے آئیں۔ عقل تو غالباً انہیں بعید از قیاس گردانے گی۔ جب ہمیں اپنے قوائے جسمانی، ذہنی اور قلبی تک کا نہ ادراک ہے، نہ تجربہ، نہ عرفان تو قوائے روحانی کی فہم کیسے ہو۔ ہم تو اپنی عقلی ظن و تخمین میں باتیں کرتے ہیں انوار و تجلیات کی۔ صفات و ذات کی جس کی بھنک بھی اس مٹی کے جسم اور اس کی سطحی عقل سے نہیں پاسکتے۔ ہمارے ذہن شعور، لاشعور کے دائرہ عمل کا جائزہ ایک ماہر نفسیات ہی کچھ لگا سکتا ہے۔ اسی طرح لاشعور کے لاشعور یا روح تک دسترس کوئی صاحب باطن ہی کر سکتا ہے۔ کسی صاحب امر کے کرم اور احسان سے جب تک اپنا ارتقائے روحانی جمادات، نباتات، حیوانات کی سطحوں سے عروج کر کے انسانی شکل میں اپنے باطن کو نہ لے آئے اور بلوغت کی منزل پر نہ پہنچے۔ اس وقت تک کیا ادراکِ روح، بصیرت روح، تیسری آنکھ، روحانی سواری، عالم مثال، عالم امر، نور محمدی کا ذکر کیا جائے۔ جب جسم میں لطافت روح آجاتی ہے تب ہی کہیں جسم بھی، روح کی تفسیری کاپی بن جاتا ہے اور روح کے مقام پر صاحبانِ تصرف کی بابت تو یہی کہا جاسکتا ہے کہ ان کی نگاہِ عمیق، ان کا قلب محیط، ان کی روح محیط ہوتی ہے۔ ان فقرائے باطن کے ظاہر کا کیا دیکھنا۔ اس ظاہر کا پردہ لے کر ہی پس پردہ باطن میں کام کئے جاتے ہیں۔ یہ رحمت کا وسیلہ ہے جو عالم انسانیت پر احسان کی صورت میں ان کے وجود سے ظہور میں آتا ہے کون کون اپنے اپنے زمانہ میں کیا کرے گا۔ اس کا شعور آگے والا زمانہ میں ہوتا ہے۔ یا ان لوگوں کو جن کی باطن میں دسترس ہے اور صاحب ایوان ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ظاہر باطن میں ایسی کھلی نشانی ہزار سال میں ہی کہیں آتی ہے اور اس کے زیر اثر جو پاک روحیں آجاتی ہیں وہ خود نورٌ علیٰ نور ہو جاتی ہیں۔ الفقر ہو اللہ۔ یہی وہ فقر ہے جس کے لئے نبی پاکؐ نے الفقر فخری فرمایا تھا اور ان کی رحمت کے انواروں اور نسبت کے طفیل ان کے فقراء کے ذریعہ یہ دولت فقر زمانہ میں نشر ہوتی رہتی ہے اور ہوتی رہے گی۔

قادر نگر کے ان ایام میں قبلہ کی وہ تربیت بھی کی جاتی رہی جس کی ذریعہ ان کے روحانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان کے اپنے مقصد حیات کا بھی تعین ہوتا گیا۔ یوں تو قبلہ کی سب زندگی محبوب کے لئے، محبوب کی امت کے لئے وقف تھی مگر اب آہستہ آہستہ وہ ذمہ داریاں بھی سونپی جارہی تھیں جن کا بوجھ انہیں آئندہ زندگی میں اٹھانا تھا۔ یعنی ظاہری زندگی میں ایک مجسمۂ اخلاق بن کر خدمت خلق کے لئے اپنے کو وقف کر دینا۔ باطن میں محبت کے رابطہ سے دکھی انسانیت کی دستگیری کرنا اور طالبانِ حق کو، حق کی طرف رجوع کرنا۔ پھر اپنی نسبت کی پشت پناہی میں عالم مثال میں بھی وہ کچھ کرنا جو رحمت للعالمین انوار کے نشر کا ذریعہ ہو جائے اور امت کو اپنی راہِ گم گشتہ پھر سے نصیب ہو۔

اسی مقصد کے تحت قبلہ کو بابا جان کا ارشاد ہوا کہ شمالی سرحدی علاقہ میں جا کر حق کی خدمت کریں۔ فقیر کو اس حکم سے سرتابی کی نہ مجال ہے نہ یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ مقصد حیات، فروغ ہے۔ اسلام بھی اسی فطری فروغ کن کی جانب اپنے پیام سے عالم انسانیت کی ہدایت کرتا ہے۔ ہر فقیر کے دل میں امت کا درد ہوتا ہے یہی اس کی سب سے بڑی سنت کی پابندی ہوتی ہے۔ یہی اس کی زندگی کا ماحصل، قادر نگر دربار میں قبلہ پر یہ بات عالم مثال میں اچھی طرح واضح کرادی گئی کہ امت کے لئے بہت کچھ ان مثال کے پردوں سے کیا جاچکا ہے۔ اب فتح مبین کا وقت آنے والا ہے۔ قوموں کی زندگی میں چالیس پچاس سال کچھ نہیں ہوتے۔ اسی یقین مستحکم کی بنا پر قبلہ نے بھروسے کے ساتھ پشاور میں سکونت اختیار کی کہ مستقبل میں صوبہ سرحد سے ایک عظیم انقلاب اُٹھے گا۔ جو اسلام کی نشاطِ ثانیہ کا علمبردار ہوگا۔ عالم مثال میں یہ بتادیا گیا ہے کہ ہندوپاک میں دو قومیں ایسی ہیں جو اسلام کی عظمت کا پرچم بلند کریں گے۔ ایک سرحد کے پٹھان اور دوسرے مالابار کے موپلے۔ پھر قدرت نے ان اقوام کو بھی منتخب کر لیا ہے جو اسلام کی پشت پناہی کا باعث بنیں گی۔ ان نقشوں کے تحت جو عالم مثال میں پہلے سے آمرین حق طے کر دیتے ہیں۔ مرضیٔ الٰہی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ چودھویں صدی کے بعد یوں بھی اسلام کی وہ ابتلا کا زمانہ ختم ہونے والا ہے جو شہادتِ عثمانؓ سے شروع ہوا۔ فقراء کا کام اپنے اپنے زمانے میں یہی ہوتا ہے کہ رحمت کے وسیلوں سے اس شجر امت کی آبیاری کرتے رہیں۔ مقامِ قلب پر یہ کام دل کی چاہ ہے۔ قامِ روح پر یہ کام مرضیٔ الٰہی کے اجراء سے تعلق رکھتا ہے اور مقامِ رحمت پر رحمت للعالمین وسیلوں سے اس امت کے فروغ کا۔ مسند فقر پر اس طرح فائز ہو کر غم امت کو اپنا لینا مردوں ہی کا کام ہوتا ہے۔ نہ نام نہ نمود، نہ ولایتیں بس قسمت میں آنسو ہی آنسو۔ درد ہی درد، سمندر کا سا سینہ، پہاڑ جیسی استقامت اور کھوکھلی بانسری جیسا جسم۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند

دز جدائی ہا شکایت می کند

قادر نگر کے قیام میں جہاں علاج معالجہ، نرم گفتاری، محبت و اخلاق کو خلق سے رابطہ قائم کرنے کا ذریعہ بتایا گیا۔ وہاں یہ بھی تعلیم ملی کہ جیسے اونٹ اپنے نرم ہونٹوں سے کڑوا نیم بھی چر جاتا ہے اور کانٹے بھی، اسی طرح تمام تلخ و تند روزگار کو اپنی فطری نرمی کے ذریعہ اپنانا ہے۔ فقیر کی ڈھال مسکینی، عاجزی، توکل۔ فقیر کی دودھاری تلوار ذکر جو ظاہر کو بھی کاٹتا ہے اور باطن کو بھی۔ اسی اسم ذات کو مشعل راہ بنا کر چاروں تصوف کے سلسلوں میں تعلیم دی گئی اور بعد ازاں اجازت بھی ملی کہ حق کی راہ میں لوگوں کو ڈالنے کے لئے جو سلسلہ افراد کی صلاحیتوں کے طابق ہو وہ بتائیں۔

نقشبندی طریقہ کا ذکر کرتے ہوئے قبلہ کہتے ہیں کہ قادر نگر دربار میں وہ شدت چڑھی کہ اوراد، نماز، نوافل، تہجد میں لگ گئے۔ نقش اللہ مجلّٰی سامنے آتا۔ بعد میں طبیعت نے نہ مانا کہ یہ اللہ ہے، یہ انجام ہے۔ سلام پھیر دیتے، کسی نقشبندی نے کہا تم تو بڑے خوش نصیب تھے۔ قبلہ نے کہا جو کچھ

بھی ہو یہ تو اللہ نہ تھا۔ حقیقت اس سے آگے کچھ اور بھی ہے۔ یہ تو سب کچھ اپنی تخلیق تھی اس کو سجدہ کیسے کرتا۔ حقیقت کا متلاشی اس میں اُلجھ کے کہاں رہ جاتا۔ چشتیہ رنگ چڑھا تو اسے اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پایا سب کچھ یار کے نام پر۔ سب کچھ یار کے لئے۔ سب کچھ یار کی طرف سے۔ میں اور تُو کی رگڑ، پھر تُو ہی تُو۔ اللہ ہُو۔ اور سہر وردیہ میں سے گزرے تو وہ دف کی تھاپ پر ذکر لا الہٰ، روح کی گہرائیوں تک میں یہ دف کی تھاپ۔ نس نس رگ رگ سے فنا۔ پھر الا اللہ کی لذتِ بقا، حی و قیوم سے رابطہ کی بات۔ اور قادریہ، وہ بندگی کی مستحکم چٹان، تقویٰ طہارت باطنی، عاجزی مسکینی، محبوب کو راضی کرنے کے لئے ایک ٹوٹا ہوا دل۔ الغرض قادر نگر کی یہی سب کچھ تربیت و تعلیم۔ اپنی آئندہ فقر کی زندگی کا سرمایہ بنی۔ جیسے مشفق باپ نے اپنی اولاد کو سب کچھ دے دیا ہو کہ اب اُن کے اپنے بعد اس نورِ نظر کے ذریعہ حق کے انوار کی تجلی زمانہ کو ملتی رہے۔ پاکستان آنے کے بعد بابا قادر اولیاء کے حضور پھر سے حاضری دینے کے لئے وجیانگر جنوبی ہند کا پہلا سفر ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ قبلہ کی اس زمانہ کی ڈائری سے اقتباسات درجِ ذیل ہیں:۔

"وجیانگر کے سفر سے پہلے عشق لیلیٰ فلم کے ایک سین میں لیلیٰ خیرات دے رہی تھی۔ سوالیوں میں مجنوں بھی شامل ہو گیا اور اپنا کاسہ لے کر لیلیٰ کے آگے پہنچا۔ لیلیٰ نے آنکھ اٹھا کر اپنے مجنوں کو دیکھا کاسہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ کاسہ ہاتھ سے گر کر چور چور ہو گیا۔ مجنوں! تم۔ تم کو میں کیا دوں۔ میں خود تمہارے لئے ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کاسہ میں کیسی کیسی درخواستیں اور کیا کیا تمنائیں بھر کر لئے جا رہا تھا۔ اللہ کا شکر ہے، خالی کاسہ بھی لے جاتا۔ صدقہ تو مل ہی جاتا انعام بھی مل جاتے مگر اللہ کا شکر ہے کہ کاسہ کو خود اپنے ہاتھوں سے پاش کروا کے چلا۔ کیسا لینا، کیسا دینا۔

دونوں جہان دیکھے وہ سمجھا کہ خوش رہا

یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

لاہور اسٹیشن پر لوگ رخصت کرنے آئے تھے۔ ان کے چہروں کی دمک ان کی بوجھل سی آنکھیں جیسے شبنم کے بوجھ سے پھول کی پتی جھک جاتی ہے۔ ہار پھولوں کی خوشبوئوں میں ان کے سینے کی خوشبوئیں شامل تھیں بعض اوقات جدائی محبت کی گہرائیوں میں پہنچا دیتی ہے۔ لاہور سے آگے کا سفر ہند، شہزادوں کی طرح کٹا۔ آسمان جو کل تک دھوپ کی شدت دے رہا تھا آج ابر آلود تھا۔ ہلکی ہلکی رحمت کی پھوار۔ راستے کے مسافر دوستوں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ کسٹم اور پولیس تک کے لوگ سراپا خلق تھے۔ اوہ! محبت بھی کتنی بڑی چیز ہوتی ہے۔ محبت دل میں امڈی ہو تو ماحول تک اس کی تائید کرتا ہے۔

راستے میں ناگپور آیا۔ ۱۳ اگست ۵۸ء کو ۲۶ محرم تھا۔ عُرس کا دن تھا، ٹرینوں کے وقفہ کے دوران تین گھنٹے مل گئے۔ دوبارہ ٹھیک اس وقت پہنچ گیا جب حاضری کے لئے مزار کا دروازہ کھلا سجدۂ نیاز پیش کیا۔ اسٹیشن کی جانب واپسی میں جلوس دیکھا۔ جتھے پر جتھے انسانوں کے، گاناڈھول، سجے ہوئے گھوڑے، ہاتھی پر عماری، جھنڈے، پھول، چادریں، نشان، علم، ریل میں سوار ہو کر وجیانگر پہنچے تو اسٹیشن پر لینے آئے تھے۔ ایک بڑی سی کار میں درِ محبوب تک رسائی ہوئی۔ بابا جان دربار میں تھے۔ ایک سجدۂ شوق پیش کیا۔ چند الفاظ فرمائے۔ بابا جان نے قوالی کا اشارہ کیا۔ ایک ڈھولک پر ایک عورت نے سرود الاپا۔ رات کو کھانے پر بابا جان نے فرمایا۔ گاندھی نے صحیح مشورہ دیا تھا کہ ناگپور دارالخلافہ ہو وہاں بابا تاج الدینؒ کی حکومت ہے۔ ان کے دامن حفاظت میں رہتے۔

صبح چہل قدمی کے وقت احساس ہوا کہ وہ فاصلے جو میلوں کے تھے۔ اب کتنے قریب ہو گئے ہیں۔ ۹ بجے صبح دربار لگا۔ اتنے قریب مگر اتنی دور۔ ابھی تک خصوصی حاضری نہیں ہوئی۔ دل اُچھل رہا ہے آنکھیں پُرنم ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ہر چیز سے واقف ہیں۔ ابھی تک کتابوں کی جلدیں جو ساتھ لایا تھا پیش نہیں کر سکا۔ ابھی وہ کتابیں مانگی نہیں گئیں۔ دربار سے چلتے وقت باباجان نے فرمایا۔ ہمیں اپنی ہی خبر نہیں ہے، کس کس کی خبر رکھیں۔ پھر دوپہر کھانے پر ارشاد ہوا۔ صبری ندی (قبلہ) اوہ کتنی گہری، دو تین تاڑ اور کتنی چوڑی مگر اس وقت پانی نہیں۔ موسم میں اف وہ تو راجمندری کو بھی ڈبو دے گی۔ یہ آگے چل کر گوداوری (باباجان) سے ملتی ہے۔

۱۶ اگست ۵۸ء:۔ یہ جو اتنی دور سے آئے ہیں۔ کوئی نہ کوئی زبردست مقصد ضرور ہو گا۔ یہ دنیا کے دھندے اور ہیں۔ بس کہہ دیتے ہیں کہ خوش رہیں گے اور فیض مل جاتا ہے۔ مگر یہ کچھ اور ہے۔ حق کا سودا ہے۔ (ندیوں) نہرو، تبرکوں (پرشاد) اور میمنوں (منین) کے دل دھک دھک کرتے ہوں گے۔ یہ حق کا سودا ہے کوئی ٹکر مکر نہیں۔ عجب کارن ہے۔

ولی الدین کے ذکر کے ساتھ، سارے پاکستان میں دو تین فقیر بنیں گے۔ دیکھو یہ چشتیہ ہی سب کچھ ہے۔ دل کا ذکر، چرخہ کی طرح دن رات چلتا رہے۔ رہا دُعا، وہ حکیم ہے، ایک پردہ ہے۔

تمہارا دل ابھی پورا پکا نہیں ہے مگر تم پکے فقیر بنو گے۔ بڑے فقیر بنو گے جتنا بڑا تمہارا باپ ہے یہ کن فیکون ہے۔ کُن اندھیرا۔ فیکون اجالا (تین دفعہ فرمایا)۔ اندھیرے سے اُجالے میں۔ سارے افسر اور ساری دنیا اور ملائک ہاتھ جوڑے کھڑے ہوں گے۔ دیکھو سُرخ پر سبز ہو گا (لال قلعہ پر اسلامی جھنڈا) اور ساری اس ساحل کی حکومت یہ جو کچھ ہے گوداوری (باباجان) کے دم تک ہے۔ یہ خشک ہوئی اور کایا پلٹا، بڑی گڑبڑ ہو گی۔ لوگ مریں گے مگر زندگی چلتی رہے گی۔ یہ اندھرا کے ساحل تک۔

**۱۷ اگست:۔** کُلُّ شیئٍ ذائقۃ الموت۔ میں کہتا ہوں کُلُّ شیئٍ ذائقۃ الاسلام۔ میں نے لالہ عبد الرحیم نیازی صاحب کی پُرزور سفارش کی۔ ارشاد ہوا آئیں گے تو پائیں گے۔ آئیں گے تو ضرور پائیں گے۔ میں نے عرض کی کہ وہ بہت ضعیف اور معذور ہیں فرمانے لگے اگر قسمت میں ہو تو آئیں گے۔ میں نے عرض کیا "آخر قسمت کا علاج بھی تو آپ کے ہاتھ میں ہے۔" ارشاد ہوا شوق اور طلب ہو تو ضرور آئیں گے اور پائیں گے۔ نہایت جوش میں تھے اور تھوڑی دیر پورا نام دہرا کر اور آنکھیں بند کرنے کے بعد فرمایا "آئیں گے تو پائیں گے۔ بے ریاضت کا پھل اور کہیں بھی نہیں مل سکتا۔"

**۲۰ اگست:۔** عبد الحمید کا ذکر کرتے ہوئے۔ دیکھو عورت کا مایا (گہرائی) دیو بھی نہ پایا دیو (بزرگ) بھی لٹ پٹ (فدا) ہوتا ہے۔ مگر خوب یاد رکھو عورت کا مایا دیو بھی نہ پایا۔ عشق عشق عشق، نہ عشق کو دیکھ سکتے ہیں، نہ سن سکتے ہیں، نہ پکڑ سکتے ہیں، اس کو مضبوط پکڑو۔

**۲۱ اگست:۔** رات کو فرمایا "عشق عشق۔ یہ ہی سب کچھ ہے۔ کُن فیکون۔ اندھیرے سے روشنی۔ سب کچھ ہوتا جاتا ہے اور ملائک مُہر لگاتے جاتے ہیں۔

**۲۴ اگست:۔** عموماً جب دربار سے حضور تشریف لے جاتے ہیں تو فرماتے ہیں تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جانا۔ کس قدر معنی ہیں، یہ کہ حضوری صرف میری موجودگی میں ہوتی ہے مت سمجھنا۔ آنکھیں مجھے نہ دیکھ رہی ہوں تب بھی میری موجودگی کو محسوس کرو۔ جیسے لوگ نماز سے فارغ ہو کر ایک گہری سانس لیتے ہیں کہ چلو فرض ادا ہوا اب ہم اپنے کام کریں۔ یہ غلط ہے، دائم حضوری صرف محبت اور عشق میں میسر آسکتی ہے۔

**۲۶ اگست:۔** باباجان نے فرمایا" دل وہی دل ہے کہ جس دل میں تری یاد رہے ایسا دل جب چاہے بند ہو سکتا ہے اور اگر بند بھی ہو جائے تو اس سے کہہ دیں کہ چل تو کلاک کے پنڈولم کی طرح چلنے لگتا ہے۔ تجھ پہ قربان۔ ترے محبوب پہ قربان اے دل۔ (گزشتہ دس سالوں میں تقریباً تین چار بار قبلہ پر ایسے دورے پڑے کہ دل ساکت۔ نبض بند، سانس بند، پھر دو ایک مٹ میں یا ایک بار تو کم از کم تین منٹ بعد واپس)

عبید اللہ حق کی زبان سے کچھ کچھ الفاظ نکل جاتے ہیں یہ بے ربط معلوم ہوتے ہیں مگر ان کو جوڑ کر، ملا کر، خوب سوچ کر، ایک تسلسل میں لکھا کرو۔ ولی اللہ میں طاقت ہے اللہ کی تیر بھی آدھے راستے سے واپس لاتے ہیں۔ ایک طوفان (جنگ) آرہا ہو تو کہہ دیتے ہیں ہٹ جاؤ (ہاتھ سے اشارہ کر کے)، صرف دل سے کہہ دیتے ہیں اور وہ ہٹ کر دوسری طرف ہو جاتا ہے۔ کوئی دیوار نہیں کچھ نہیں... بہت سے ولی اور پیغمبر آئے اور اپنا کام کر کر چلے گئے۔ وہ گمان میں رہتے تھے کہ یہ ہو گا اور وہ ہو گا۔ وعدہ کے ساتھ کون آیا اور کیا کرے گا۔

**۲۷ اگست:۔** توکل بڑی چیز ہے توکل بر اللہ۔ اللہ کارساز ہے چاہے پندرہ سو میل دور ہو۔ دل سے یاد کرو اور یہاں مہر لگ جاتی ہے۔

**۲۸ اگست:۔** عنقریب گودا وری چلنے والی ہے پھر دیکھو لال کی مب پھرے گا ضرور اور یقینی سبزی پھیل جائے گی۔ (یعنی لال قلعہ پر اسلامی جھنڈا ہو گا)

**۳۱ اگست:۔** فرمایا ہر کوئی خدمت کے لئے آتے ہیں۔ آدمی ہی نہیں ملائک بھی ہزاروں اگر دیکھنا چاہو تو معمولی لباس میں داڑھی جبہ میں نظر آئیں گے اور پھر غائب، اگر منکر نکیر سے بھی کہہ دیں مت آنا تو نہیں آئیں گے۔ یہ مٹی کا پتلا تو یہاں کھڑا ہے مگر ہے کہاں، کس کے دل میں بسا ہے۔ یہ غیب کی باتیں ہیں۔ ایمان بدل گیا تو دنیا بدل گئی۔ پھر کچھ نہیں، ہزار نماز پڑھو، سر پٹکو۔ اس در سے دُھتکارا ہر در سے دُھتکارا جائے گا۔

**۲ ستمبر ۵۸ء:۔** اکیسویں شب کھانے پر باباجان نے قبلہ سے فرمایا" یہ زمین بنی یہ فلک بنا۔ یہ ملک بنا یہ بشر بنا، کوئی بادشاہ و امیر ہے کوئی بے نوا و فقیر ہے۔ جسے چاہا جیسا بنا دیا، تری شان جل جلالہٗ جسے چاہا مُردہ بنا دیا، جسے چاہا زندہ اٹھا دیا۔ ترے ہاتھ میں ہے فنا بقا تری شان جل جلالہٗ۔ یہ سب لفظ کُن کا ظہور ہے۔ روح الامین کو سینچے جاؤ۔ سانس اندر رزاق (جلی) سانس باہر اداب۔ تصور بھی صرف رہبر کا۔ ادھر اُدھر کے تصور آئیں تو ہٹا دیں (دَم) جب مجھ میں تو ہو جائے اور تجھ میں میں۔ (کالی توحید) تو پھر تو کون و میں کون۔ ملک الموت بھی ایک چرواہے کی شکل میں آتا ہے کہ میری بکری دے دو۔ دُھتکارو تو چلا جاتا ہے۔ پچاس ہے سمجھو دس اور۔ اور پھر دس اور۔ اور چاہو تو دس سال اور۔ یہ جتنی شکتیاں ہوتی ہیں صرف کہو کہ جوتے سے مارو تو ان کے جوتے تڑاتڑ لگتے ہیں اور جتنی بلائیں اور گردشیں ہیں وہ سو گز، ہزار گز دور رہتی ہیں۔ اگر چاہیں کہ جوتوں کو چومیں تو بھی نہیں آسکتیں

**۳ ستمبر ۵۸ء:۔** بسم اللہ۔ نئے دور کا پہلا دن۔ کیا لطف، سرور و مستی ہے خود بہ خود می آید ایں رفتارِ دوست۔ دوپہر کھانے پر بابا جان نے فرمایا۔ سنا۔ صابری ندی (قبلہ) خوب زور سے چڑھ رہی ہے۔ ایک گھنٹہ میں تین انچ۔ گرمیوں میں دیکھا تھا۔ اُف ایک تاڑ دو تاڑ کا گہرا بہاؤ تھا اور صرف بیچ میں پانی پر کشتیاں بہہ رہی تھیں۔ یہ گوداوری میں ملتی ہے۔ مگر راجمندری کو کوئی خطرہ نہیں۔ ندیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی بارش ہوئی۔

**۱۵ ستمبر یکم ربیع الاول:۔** بسم اللہ۔ آج صبح کے دربار میں بہت بھیڑ تھی۔ حضور کی عجب شاہانہ شان تھی۔ دوپہر دربار خاص میں فرمایا "یہ جنگی جہاز ہے، یہاں آیا تھا۔ (مراد قبلہ سے تھی) عبید اللہ پنجگانہ برابر ادا کر رہے ہو نہ۔ یہ اپنی جگہ اور جو ذکر ہے وہ قائم رہے ایک دفعہ یاد اور فتح۔

**۱۹ ستمبر:۔** دربارِ عام کے بعد جلوعِ عام میں بابا جان نے فرمایا اور بھی بزرگ آئے اور زندگی میں کچھ کر گئے۔ مرنے کے بعد بہت کچھ کر رہے ہیں۔ مگر یہ کبھی تم نے دیکھا یا سنا کہ زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے مرنے کے بعد کیا کیا ہو گا تا قیامت۔

مہندی کے پتے ہاتھوں پر باندھ لیں تو کیا ہوتا ہے۔ مہندی کو پہلے پانی کے ساتھ خوب خوب رگڑنا ہوتا ہے۔ پانی ضروری ہے، (ذکر) تھوڑی رگڑ کے بعد پیلا رنگ چڑھتا ہے (سپردگی) اور رگڑ کر لگاؤ تو سرخ (عشق کی آگ) اور خوب رگڑو تو سیاہ (توحید) یہ میں اور تُو کی ہے۔ یہی ریاضت ہے، پھر شہادت کی انگلی بائیں ہاتھ کی انگلی سے ملا کر فرمایا۔ میں اور تُو ہے، تو مجھ میں، میں تجھ میں پیر ہی دل میں بسا ہے۔ ایک ہی ہے، چوبیس گھنٹہ رگڑ۔ دل یہ دل میں دل وہی دل ہے کہ جس دل میں تری یاد رہے۔ تجھ پر صدقے ترے محبوب۔ یہ صرف فقیروں کو معلوم ہے۔ جواب دیا ایسا ہو جائے گا اور ہو گیا ۔ ایسا نہیں ویسا ہو جا اور ہو گیا۔ سب کو ایک دن جانا ہے۔ ہاں کسی کا بھلا کرو تو وہ ساتھ جاتا ہے اور کام آتا ہے۔ البتہ رنگے ہوئے ہاتھ کا رنگ نہیں چھوٹتا۔ جو یقین ایمان پکا ہو تو تُو میں ہوں اور میں تو ہے۔ بغض سے تباہی ہے۔ فقیری میں ایک مقام ایسا آتا ہے کہ پیر سے حسد اور بغض پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بڑی سخت تباہی ہے۔ صحیح نماز اس تباہی سے بچاتی ہے۔

**۲۰ ستمبر:۔** رات کو ارشاد ہوا:

ترے لفظِ کُن کا ظہور تھا تری شان جل جلالہٗ

جسے چاہا جیسا بنا دیا تری شان جل جلالہٗ

جسے چاہا مُردہ بنا دیا جسے چاہا زندہ اٹھا دیا

ترے ہاتھ میں ہے فنا بقا، تیری شان جل جلالہٗ

کوئی بادشاہ امیر ہے، تو، تو بے نوا فقیر ہے

جسے چاہا جیسا بنا دیا تری شان جل جلالہٗ

جب میں تجھ میں ہو گیا۔ تو تو کون اور مَیں کون۔ کوئی شخص سامنے آیا، بس کہہ دیا جا تیری جیت۔ قسمت میں نہ بھی ہو تو کہہ دیا جا تیری جیت۔ بس کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں۔ چوبیس گھنٹہ نفس و جان کا چرخہ چلتا رہے اور پنجگانہ ادا کرتا رہے، یہ بندگی ہے۔ سارا، سب کچھ ایک لفظ کُن۔ اس کو خوب سمجھو اور لکھو۔ دنیا کے کام آئے گا، تیرے ہاتھ میں ہے، فنا بقا، چاہے ہڈیاں گل گئی ہوں۔ یہ باتیں اگر لکھ بھی دیں تو بہت کم ہوں گے جو سمجھیں گے یا پکڑیں گے مگر تم خوب سوچ کر لکھنا۔

**۲۴ ستمبر ۱۰ ربیع:۔** ابتدائے آفرینش کی طرح آج سارا آسمان کالے بادلوں سے گھرا ہوا ہے۔ صرف ایک قطعہ پر عجب قسم کی روشنی ہے ہر چیز نکھری ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔

اقراء باسم ربی، پڑھ اپنے رب کے نام کے ساتھ، یہ حکم ہوتا ہے ایک اُمی کو بسم اللہ بہ اسم اللہ۔ رب صفات کا مجموعہ ے۔ اللہ ذات کی نشانی ہے۔ اسم اللہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اسماء سکھلا کر فرشتوں پر فوقیت دی۔ اسم اعظم کیا ہے۔ کُن فیکون کی چابی کون سی ہے۔ جبرئیل کون تھے۔ اور اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے درمیان یہ قاصد کون ہے۔ روح الامین کیوں کہلائے۔ ان کو اگر سینچے تو یہ برکت بسم اللہ کُن فیکون کی چابی مل سکتی ہے۔

**۲۶ ستمبر ۱۲ ربیع:۔** آج امتی دن ہے۔ پیش کرنے کے لئے سوائے اس کے کیا ہے۔ غربت جہالت، ایمان کی کمی۔ آج ہم اس اُمت بدنصیب کے لئے دعا کریں گے تو اس کے گناہوں کو بخش دے اور اپنی حیاتِ طیب سے اس کو زندگی بخش۔ آج صبح سے ولی الدین بے اختیار یاد آرہے ہیں۔ ایک بیمار تھا۔ حکیم کے آگے پیش کرنا تھا۔ یہ سوچا کہ وہ تو کُن فیکون ہے۔ بیمار کو کیا پیش کریں۔ تین ٹکڑے کئے اور پیش کئے۔ اب ان کی مرضی کوے چیلوں کو ڈال دیں یا زندہ کریں۔

حضور نے جو بکری والے مستان کا ذکر کیا تو میں نے سوچا کہ صرف ضربت، جہالت اور کم ایمانی ہی بیماریاں نہیں ہیں۔ اس امت کو جذام کی بیماری ہے۔ پھر بابا جان نے کچھ دیر آنکھیں بند کرنے کے بعد فرمایا ٹھیک ہو جاتا، خواہ ہڈیاں ہی گل گئی ہوں۔ یہ کُن فیکون ہے۔

**۱۴ ربیع:۔** ارشاد ہوا، کھانے کے بعد دماغ بے کار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تو پیٹ پر پتھر باندھتے تھے اور ختم المرسلین کہلائے اور ہم سب ان کے امتی۔ کیا کھانا چاہتے تو ایک روٹی کا ٹکڑا نہ ملتا۔ مگر ان کو سوچنا تھا۔ دوپہر تھوڑی سی دیر لیٹ جاتا ہوں۔ نماز جب تک ٹھیک نہ ہو نہیں چھوڑتا۔ جب تک کام پورا نہ ہو پکڑ پکڑتا ہوں۔ جب خیال آیا تو پورا کر کے چھوڑتا ہوں۔

**۱۶ ربیع:۔** ارشاد ہوا، تم اپنے خیال یا ہٹ پر قیام مت کرو۔ بلکہ محبت، عشق دل میں رکھو اور رحمت کے منتظر رہو۔ رحمت کا روپ وہی ہو گا جو تمہارے لئے بہترین ہو۔ ممکن ہے تمہارا خیال تمہارے حق میں بہتر نہ ثابت ہو۔ حق کو تم سے محبت بھی ہے اور عشق بھی۔ وہی کرے گا جو تمہارے حق میں بہترین ہو۔

اپنی ذہانت یا ترکیبیں مت کرو، جو بات بتائیں دردِ دل سے کرو۔ وہ راستے خود بخود پیدا ہو جائیں گے حق کو جو منظور ہیں۔

**۱۸ ربیع:۔** بغض یا حسد یا کینہ کا کیڑا ایسا چور ہے کہ بہ ظاہر سر بسجدہ ہوتا ہے مگر یہ کیڑا دل کا گوشت کھاتا رہتا ہے اور تباہی و بربادی کا باعث ہوتا ہے۔ اس کا واحد علاج عجز و انکساری ہے۔ چاہے جذامی ہو یا کوئی ہو، ہر ایک کے آگے خلوص دل سے ہاتھ جوڑنا ہے کہ یہ تیرے ہی روپ ہیں۔ دوسری بات یہ کہ پیر کا حکم بظاہر بڑا ہی سادہ ہوتا ہے مگر اٹل ہوتا ہے اس میں اگر تاویل پیدا کریں یا بال برابر بھی تجاوز کریں تو عین بربادی ہے۔ اس کی استقامت نماز سے حاصل ہوتی ہے کسی حال میں نہ چھوڑے۔

**۱۹ ربیع الاول:۔** فنافی الشیخ، فنا الرسول، فنافی اللہ، مہندی ہاتھوں میں باندھ لیں تو کیا فائدہ۔ پانی ملا کر پیتے جائو، پیلا رنگ اور باریک پیسو سُرخ اور بالکل باریک پیس ڈالو تو کالا۔ جو کبھی نہیں چھوٹتا، فنافی الشیخ بابا تاج الدینؒ تھے۔ اتنا فنا ہو کہ تو میں ہوں اور میں تو یا تم (محبت بھری نظر سے دیکھا)۔ پھر اسی کے امتی ہیں۔ ماز ادا کرتے ہیں، پھر اللہ، تُو اللہ ہے یا میں اللہ۔ مگر یہ چیزیں بغیر ریاضت کے ممکن نہیں۔ اگلے بزرگ تھے مگر دنیا کے ٹوکر سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہے۔ مگر کیا کوئی جلال تم دیکھتے ہو۔ جمال ہی جمال ہے۔ سب کچھ روبرو ہے۔ کہہ دیا اور سو گیا راستہ کھول کر بھی بتائیں تو کسی کو سمجھ میں نہیں آتا۔ راہبر ہی بتا سکتا ہے۔ ارشاد ہو اذکر، فکر کے ساتھ کیا کرو۔ خیالِ یار کا نام فکر ہے، نہ صرف قلب ہی چلتا رہے بلکہ اس کے ساتھ خیال بھی لگا رہے جب خیال پکا ہو گیا۔ ہمہ تن متوجہ ہوئے تو تصور جم گیا اور توجہ قائم ہو گئی۔ ذکر چوبیس گھنٹہ چلتا رہے اگر صحیح ذکر، فکر کے ساتھ صرف آدھ گھنٹہ بھی ہو تو چوبیس کے برابر ہے اور چوبیس گھنٹہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ دن میں ہر توجہ کے اختتام پر ذکر ہو اور سوتے وقت اسی میں سو جائیں۔ اسی میں صبح کو اٹھیں۔ ایک تیسرا طریقہ پاس انفاس والا ہے۔ یہ ذکر فکر تحت الشعور میں جم جائے۔ یہ مٹ نہیں سکتا۔

**۲۰ ربیع:۔** ٹھیک چار بجے شہنائی شروع ہوئی۔ عجب کیفیت ہو گئی پاس لوگ بیٹھے تھے مگر آنسو تھے کہ اُمڈے آ رہے تھے۔ نہ معلوم یہ غم کے آنسو تھے یا خوشی کے۔ روح کی سواری شہنائی کے راگ پر، مُڑدنگ کی تال، جبرئیل خادمہ، والبراق مرکبہ، والمعراج سفرئہ وسدرۃ المنتہا مقامہٗ وقاب قوسین۔۔۔۔۔۔۔

یہ صرف روح کی سیر نہ تھی بلکہ سفر تھا۔ راستے کی کیفیتیں اور لطافتیں تو اپنی جگہ، منزل ہمیشہ حد نظر میں، پھر دیکھئے وہ دل کا اضطراب جو فزوں تر ہوتا جاتا ہے۔ اسی کیفیت میں اذان، پھر نماز۔ اُف نماز کتنی پیاری چیز ہے۔ کتنا احسان ہے اس مالک کا کہ اتنی آسانی سے بحضور کبریا رسائی ہو جاتی ہے۔ شہنائی کے ترنم پر روح کا ذکر، ڈھولک کے دائیں پر نفس اور بائیں پر قلب کا ذکر جلی و خفی، حضوری، شہنائی کے ساتھ روئیں روئیں سے سننا اور رگ رگ کا نپنا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح ازلی کبھی دور سے کبھی شہ رگ سے بھی قربت ہو کر اس وجود۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور جاں آفرینی سے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ ڈھول پر دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں ایسا معلوم ہوتا ہے یہ سر کا سودا ہے اور تگ و دو میں سرگرداں ہے۔ یہ کیسے پہنچے۔ بائیں لکڑی کی دھم گویا یہ قلب کی رفتار ہے۔ مستانہ وار۔ ایک ہاتھی کی چال کی طرح۔ منزل جاناں کی طرف رواں دواں۔

دو گھڑی کے لئے سُرپی بند ہو گئی ہے۔ اُف کس قدر صفائی کے ساتھ جیسے گہرے بادل پھٹ گئے ہوں اور سورج کی نکھری ہوئی کرنیں فضا کو منور کر رہی ہوں۔ زندگی سے ماوراء، وجود کی پابندی سے آزاد۔ یہ روح کی نکھری ہوئی آواز۔ کس بانکپن سے اشارہ کر رہی ہے کہ چلے آئو شہنائی تھم جاتی ہے۔ سُرتی پھر رواں ہے۔ دونوں ڈھولوں میں سوال جواب ہوتا ہے۔ یہ میں اور تُو کی کشمکش۔ جب دونوں یکے بعد دیگرے ترازو میں پورے اترے تو پھر دونوں ساتھ بجنے لگتے ہیں۔ چار ہاتھ ہیں، دو ڈھول ہیں، مگر ایک آواز، میں، تُو، جان، قلب، روح۔ یہ پنجتن پاک کا گویا دستِ مبارک ہے۔ علی، عثمان، عمر، ابو بکر میم کا انگوٹھا۔ بیچ میں لے کر مٹھی بند کیجئے۔ دل کی کلی بن جاتی ہے۔ کھولیں تو دست عطا ہے۔ سر پہ سایہ ہے۔ پیٹھ پہ ہاتھ ہے۔

**۳۰ ربیع:۔** اے مالک جو میرا عشق ہے یہ صرف تیرے عشق کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جب ذرا دل کی صفائی ہوئی۔ جب ذرا میں کا پردہ ہٹا تو دیکھا کہ شعاع تیری طرف چلی۔ اس کا پتہ چلا جب میں نے تیری ایک جھلک دیکھی۔ تو فنا در فنا ہو گیا۔ میرے مالک، میرے آقا تو ہی تو ہے۔

**۳ ربیع الثانی ۱۷ اکتوبر ۵۸ء:۔** آج بابا جان کے ساتھ تصویر کھنچوائی۔ جو چنپا کے تین پھول بابا جان کے ہاتھ میں تھے مجھے دیئے۔ دائیں طرف بچھی نرائن تھے، بائیں طرف مَیں اور درمیان میں بابا جان۔ یہی تصویر کسی نے دو مہینہ پہلے بشارت میں اسی تعین کے ساتھ پہلے سے دیکھی تھی۔ اب سوچو کہ یہ ہمارے اعمال اپنے ہیں یا پہلے سے مقرر شدہ نقوش کی تائید۔ پھر یہ بے چینی کیوں اور یہ رونا کیوں۔ اگر دل سے مجبور ہو تو خیر یہ گوہر اگر بیچو نہیں تو تاج کی سجاوٹ کے کام میں آئیں گے۔

دربار میں جب بابا جان کے پیر سُن ہو گئے اور باہر کئے تو مجھے پیر دبانے کا موقع ملا... الحمد للہ۔ دل سے خدمت کے معنی سمجھ میں آئے۔ بابا جان کے پیر میں دبا رہا تھا اور آرام مجھے ملا ساتھ ہی جیسے میرے پیر بھی دبائے جا رہے ہیں۔

آج دربار کے بعد کڑک بجلی مستان سے جذب و سلوک پر گفتگو رہی۔ محبوب، ودود، قرب جدائی، تخلیق عالم، غوث، قطب ابدال اسم اعظم وغیرہ پر باتیں ہوتی رہیں۔ قرآن مجید کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ قرآن کھانے میں اتنا مزہ نہیں آتا۔ جتنا اُگلنے میں، اندر سے باہر نکالیں تو اس کی کچھ اور ہی لذت ہوتی ہے۔ یہ بھی فرمایا کہ تین قرآن ہیں۔ ایک فرقان عظیم، ایک حدیث قدسی، ایک حدیث رسولؐ۔ یہ جو اہل شیعہ کہتے ہیں کہ دس جزو غبن ہو گئے۔ ی بات دوسری ہے یہ دس جزو، زمانہ کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔ حکم حق کا ہی ہوتا ہے مگر پورا کرنے والا ہے۔

**۱۸ اکتوبر ۵۸ء:۔** آج صبح رفعی فقیروں کے حلقے میں ذکر ہوا۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بابا جان نے فرمایا "عبید اللہ اس سرحدی پٹھان کے ہاتھ سے ان فقیروں کو بیس روپیہ دلوا دینا۔ شکر الحمد للہ۔

**۲۲ اکتوبر:۔** دین کی پختگی اور ترقی کے لئے دنیا کا ہونا ضروری ہے۔ دنیا کے بغیر جسے یکسوئی کہتے ہیں وہ ایک خام چیز ہے۔ دھوکہ ہے، اس کا راہر وایک تالاب کے مینڈک کی طرح خطرات سے محفوظ مگر بند رہتا ہے۔ دنیا میں رہے تو باطنی طور سے ایک دیوار کی حد سے جو پار ہو جاتا ہے اس کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں اور جو اس طرف ہو جائے وہ دنیا میں پھنس جاتا ہے۔

نیند بری طرح لپٹی ہوئی ہے۔ جی چاہتا ہے ۷۲ دن تک سوتا رہوں، کوئی تھکن نہیں ہے۔ نہ جوش ہے نہ ہی سکون کی کیفیت ہے۔ لیلیٰ نیند کی صورت محیط ہے۔ اندر باہر نیند ہی نیند ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو لیلیٰ کالے برقع میں نظر آتی ہے۔ اب تک میں محمل کو ہی لیلیٰ سمجھ بیٹھا تھا مگر جیسے ہی آنکھیں بند ہوتی ہیں تو بس لیلیٰ ہی لیلیٰ ہے۔ نہ نور ہے نہ نار ہے۔ یہ سورۂ یٰسین پڑھنے سے نہیں بلکہ ہونے سے روشن ہوا۔

**۱۴ ربیع الثانی ۲۷ اکتوبر ۵۸ء:۔** آج صبح بھی حضور دربار میں تشریف نہیں لائے۔ دوپہر کھانے پر ارشاد ہوا اٹھالو۔ پانچ گرم گرم پھلکے اٹھالئے۔ اجازت اتوار ۲ نومبر کی ملی ہے۔ ۸ سال تک دو ملتے رہے اور خادم کہتے تھے نہ معلوم یہ دو حصے کیوں ہیں اس کے بارہ سال ہوئے پہلے چلے میں تین ملتے رہے۔ دوسرے چلہ میں چار۔ آج پانچ، مگر فرمایا اٹھالو۔ یہ ذمہ داری یہ بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ دودھ پینے کے زمانے ختم ہوگئے۔ خود چبانا ہوگا اور ٹوکرے اٹھانا پڑیں گے۔

**۲۰ ربیع الثانی ۲ نومبر ۵۸ء:** جب قادر نگر سے چلا تو شہنائی کی ٹولی نے، السلام، یا نبی سلام علیکم بجانا شروع کیا وہ طلوع کی نازک اور لطیف روشنی وہ ہلکا ہلکا سرور، دل کی اُمنگیں عجیب زندگی است، عجب تر حیات است"

ایک طائرانہ نظر سے دیکھا جائے تو جہاں ناگپور کے دربار میں نگاہوں سے کام، کلماتِ کُن سے کام اور ٹھوکر سے کام ہو رہے تھے وہی اب کچھ جمالی رنگ میں دربار قادر نگر سے ہو رہا تھا۔ اب جلالِ کبریائی کو جمالِ مصطفوی کا روپ ملا تھا۔ آتش عشق کی تپش سوزاں کو اپنے وجود میں جذب کر کے گلزار بنا دیا گیا تھا اس کے لئے بابا قادر اولیاء کو ناگپور سے عین عالم جوانی میں واپس آنے کے بعد اکیس سال جذب میں گزارنا پڑے تھے۔ پھر جب جذب سے باہر آئے تو باقی عمر سلوک کی خداوندی شان سے زمانہ کو فیض پہنچایا۔ خود بابا جان کا ارشاد تھا کہ اس امت کے لئے جتنے ٹوکرے ہم نے ڈھوئے کسے ڈھونے پڑے تھے۔ اب امت کو کچھ نہیں کرنا سوائے اس کے کہ پھل کھائے۔ اب فتح مبین ہے، جن آنکھوں نے دربار کے نقشے دیکھے وہ اس نتیجہ پر ضرور پہنچے کہ اب بابا تاج الدینؒ نئے روپ میں جلوہ فگن تھے گویا

نظر آیا جلالِ کبریا شیر خدا ہو کر

جمال اللہ کا ظاہر ہوا مشکل کشا ہو کر

اس ناگپور والی عقل کو خیرہ کر دینے والی شانِ ولایت کے بعد قلوب کی سطح پر کار فرمائی تھی۔ قلوب کو حق کی جانب رجوع کرنے کے لئے محبت و فیض کے دریا جاری تھے۔ اُسی ناگپور کے عطا کردہ فقر کے طفیل، کاروانِ انسانی کو ایک اور قدم آگے بڑھانے کا راستہ کھول دیا گیا۔ بابا قادر اولیاءؒ کی جمالی شان میں محبت و عشق کی وہ محفل جمی جس کی صدائے بازگشت جگہ جگہ عالم انسانی کے قلوب سے آج بھی گونج رہی ہے۔ چونکہ یہ فقرائے باطن عالم مثال سے کام کرتے ہیں اس لئے اپنے زمانے سے پہلے ہی انکا ورود ہوتا ہے۔ اور زمانہ عقل و ہوش و بصیرت رکھنے کے باوجود ان فقراء کی حقیقت سے ناآشنا ہی رہتا ہے۔ یہ سلسلہ در سلسلہ کڑی در کڑی وہ نظام ہے جس کی بنیادوں پر ہی کہیں اگلے زمانوں میں ظاہر کے بھی فروغ کی راہ کھلتی ہے۔ اس طرح ظاہر باطن کی میزان میں حیاتِ انسانی جاری رہتی ہے۔ ظاہر بینوں کی نگاہیں ظاہر تک رہتی ہیں اور مصلحین ظواہر ہی کو فروغ کا باعث سمجھتے ہیں۔

اسی طرح باطن میں رسائی رکھنے والوں کے لئے باطن ہی حقیقت ہے اور فروغ کی راہ باطن میں ہی ہے۔ مگر حق کی نظر سے دیکھا جائے تو پہلے باطن اس کے بعد ظاہر، دانہ دانہ کی فطرت میں ودیعت ہے۔ نہ باطن کے بغیر ظاہر کے کوئی معنی ہیں نہ ظاہر بغیر باطن کے کوئی معنی رکھ سکتا ہے۔ وحدت کے انداز میں باطن اور ظاہر ایک ہی حقیقت ہے۔ ایک ہی یکتائی ہے۔ زمانے کے فرق اور فاصلوں سے اس حقیقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہر شجر مبارک کی جڑ پہلے زمین میں ہے مستحکم ہے اور پھر اس کی فرع اس کا ظاہر آسمانوں میں پھیلتا ہے۔ اس لئے سمجھ دار کے لئے یہ باطن ظاہر کا تضاد دراصل کوئی تضاد نہیں۔ یہ تو صرف عقل کا پیدا کردہ تضاد ہے۔ ظاہر کا ہر عمل تو اُس صداقت کی گواہی دیتا ہے جو باطن میں ہے۔ اذان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اس باطنی رجوع کی تصدیق ہوتے ہیں جو ایک طالب کو میسر ہوتا ہے۔ اب اس قلب کی دنیا سے ایک قدم آگے سارے زمانے کے لئے وہ راہ بھی کھلنی ہے جب جلال، جمال کے روپ کو کمالی شان میں دھار کر انسان کو اس کے اعلیٰ مقام کی طرف لے جانا ہے۔ یہ مقام روح یعنی عالم امر کی بات ہے۔ اور فی زمانہ فقرائے باطن کا عالم انسانی کے لئے یہی خصوصی کام ہو گا۔

قبلہ درانی صاحب نے اس حقیقت کو اچھی طرح جان لیا ہے کہ انفرادی تمام بلندیوں کے باوجود ہر فقیر کو اپنے اپنے زمانے میں وہی کام سپرد ہوتا ہے جو اُس زمانہ کے لحاظ سے عالم انسانی سے رابطہ کی بات ہو۔ اور اگلا قدم، اگلا بوجھ اپنے اپنے زمانے میں دوسروں کو اٹھانا ہوتا ہے۔ اپنا انفرادی عروج ایک طرف، افراد کی اصلاحِ باطن یا ارتقائے باطن ایک طرف۔ مگر عالم انسانی اور امت کے لئے صرف اسی حد تک اس کا مشن ہوتا ہے جس سطح پر اس زمانہ میں باطن عالم انسانی آچکا ہوتا ہے۔ چنانچہ اب اگلا زمانہ اس جمعی سطح پر کام کرنے کا مقام روح ہے اور مقام روح میں قدم رکھنے کے بعد روحِ اعظم سے رابطہ ہے۔ انفرادی روح کی حقیقت روحِ اعظم کے جمعی انداز میں ہونا ہے جس کے لئے بغیر جمعیت کے کام نہیں بنتا اور اسی لئے ایک توحید فکر فقراء میں آنی ہے۔ یوں بھی زمانہ کے لحاظ سے یہ گروہ بندی اور جمہوریت کا زمانہ ہے۔ اسلام کا وہ پہلا پیام جمعیت بندی اب مادی سطح پر بھی ہونا ہے، قلب کی سطح پر بھی ہونا ہے اور روح عالمِ امر کی سطح پر بھی ہونا ہے۔ تب ہی کہیں اسلام کا پیام تمام عالمِ انسانی میں پھیلایا جا سکے گا۔ مشیت ایزدی کے تحت زمانے کے مطابق فقراء کا ظہور ہوتا رہا ہے۔ انسانی جسم کی زندگی محدود اور مختصر ہے اس لئے ایک جسم کی فنا کے بعد دوسرے جسم کو یہ ذمہ داری نبھانی ہوتی ہے۔ چراغ سے چراغ اس طرح جلتا چلا جاتا ہے اس میں نہ کوئی فرق والی بات ہے نہ بڑے چھوٹے کی بات۔ ایک ہی توحید میں ہو کر کہیں اس چراغ کی بتی کو اپنے وجود سے وہ تیل دیا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ یہ چراغ روشن رہے جب تک عشق میں فنا ہو ہو کر اپنے وجود کی ہر صفت تک کو فنا کرنے کی حالت نصیب نہیں ہوتی اس نور کو نہ پا سکتے ہیں نہ چراغ روشن رکھ سکتے ہیں۔ جب تک عشق کی آگ کو بھڑکا بھڑکا کر اور تیز نہیں کر دیا جاتا۔ یہ آگ روشنی نہیں بنتی۔ آخر اس روشنی کو بھی آگ ہی کا احسان ملتا ہے تو روشنی بننے کے قابل ہوتی ہے۔ یہ خوش نصیبی تھی کہ قبلہ نے بار بار ناگپور اور قادر نگر حاضری دے دے کر نہ صرف بابا تاج الدینؒ اور بابا قادر اولیاءؒ کے مشن کو سمجھنے کی کوشش کی بلکہ برسوں کی کاوش اور مرشد کے احسان سے اس کو اپنا کر، اپنا حق بندگی بھی ادا کیا لوگ بندگی کو سطحی معنی دے کر بڑی سادگی سے اس بندگی کی حقیقت کو پھول جاتے ہیں۔ عبد ہونا آسان نہیں اس بندگی کے عروج میں بھی رمز در رمز اور اس کے نزول میں بھی گنج ہائے گرانمایہ ہیں۔ پھر عبید جو نامِ گرامی ہے اس کے معنی تو ایک چھوٹا سا عبد کے ہیں۔ اتنا چھوٹا کہ اپنے کو ہر ایک کی جوتیوں کی خاک سمجھے۔ مگر اتنا کون جھکتا ہے جو اپنی جوتیوں کی خاک تلے اس عبید کے رمز کو پائے۔ حق ہے جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے انسان کیا اس کی بساط کیا۔ یہ عبدیت، یہ بندگی یہ غلامی، احسان ہی ہے مرشد کا، بغیر راحت کرم کے کون اس منزل میں ثابت قدم رہ سکتا ہے جب سب کچھ قدموں میں ڈال دیا گیا ہو۔ جب پوری کی پوری امانت جو سلسلہ در سلسلہ پہنچی ہو سپرد کر دی گئی ہو۔ جب انفاس

اور آفاق دونوں کی شہنشاہیت عطا کر دی گئی ہو اور پھر بھی مرشد کے قدموں سے سر نہ اٹھ رہا ہو۔ تب صحیح بندگی ہے۔ یہ عشق کی بھی معراج ہے کہ سب کچھ عطائوں کے بعد بھی وہی طوقِ غلامی مقام بندگی دے کر نہ لوشانِ خداوندی

جمعہ ۲۷ جنوری ۱۹۶۱ء کو قبلہ کے مرشد بابا قادر اولیاءؒ کا وزیانگرم (جنوبی ہند) میں انتقال ہوا۔ ادھر قبلہ کچھ دن قبل مشرقی پاکستان میں تھے۔ مُرشد کے پاس جانے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ فرماتے ہیں ادھر جاتا تو گڑبڑ پڑ جاتی وہی حال کہ

گوری سوئی سیج پہ مکھ پر ڈارے کیس

چل خسرو گھر آپنے سانج بھئی چو دیس

حکم کے تحت رکنا پڑا۔ سرتابی کی کہاں مجال۔ قہر درویش بر جانِ درویش، آنکھیں فرطِ غم سے سُرخ ہو گئیں۔ بالکل خون سے لبریز ایسی کہ قبلہ سے نظر ملانے کی کسی میں مجال نہ تھی۔ سچی پیت کنول بھئی جل سوکھے جل جائے۔ اسی حالت میں پاکستان لوٹے اور چند دن بعد جب بابا جان کے وصال کی خبر آئی تو یہاں پہلے ہی سے یہ حالت طاری تھی کہ جیسے کالے ناگ نے کاٹ لیا ہو۔ پندرہ دن موت کی سی غشی۔ ایک سینما سا بلکہ اس سے بھی تیز آنکھوں کے آگے سے گزر رہا تھا۔ ادھر پشاور میں ساتھیوں کی مختصر سی جماعت نے غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔ ضیاء جعفریؒ مرحوم نے امامت کی۔ ان کا فرمانا ہے کہ بابا جان ساتھ ہی کھڑے تھے پائوں میں لرزہ سا آگیا گرا جاتا تھا مشکل سے ہی نماز ادا کرائی معتقدوں میں سے بھی تائید ہوئی کہ بابا جان موجود تھے تو ہم یہ سوچتے تھے کہ یہ نماز کیسے ہو گی۔ قبلہ کا فرمانا ہے کہ اس نماز کے بعد سے بدلی سی کھلی۔ اب معلوم ہوا کہ میں ہی رانجھا۔ میرا ہی وصال ہوا ہے، اب کالا ناگ کاٹ لے تو پھر کسی ناگ کے کاٹے کا اثر نہیں ہوتا۔ موت تو درجاناں کا نام ہے۔ ان کے لئے جن کو ایک جھروکی مل چکی ہو۔ ایک بڑا کارخانہ چل رہا ہو مسینیں چل رہی ہوں۔ روشن ہو پھر یکایک بجلی بند ہو جائے تو گھپ اندھیرا۔ پھر دوسرا سوئچ آن کر دیا جائے تو وہی ظہور کی روشنی وہی کُن فیکون۔ مشیت اپنا عمل کرتی رہتی ہے۔ یہ خود بخود ہوتا ہے بس اللہ اللہ کرتے جائیں۔ الماری میں کتابیں ہوتی ہیں وہ بھرنا ہوتی ہیں۔ یہ شریعت دیں کو جو ظاہر بازی کا خول دے کر پردہ کر رکھا ہے اس کو توڑنا ہوتا ہے۔ یہ درود وظائف ننگ فقر ہیں۔ عاشق کا مقام دوسرا ہے۔ محبت کو ان چیزوں ک کیا ضرورت۔ اصل ایمان محبت ہے۔ نبی کریمؐ سے محبت ان کی امت سے محبت کو ان چیزوں کی کیا ضرورت۔ اصل ایمان محبت ہے۔ نبی کریمؐ سے محبت ان کی امت سے محبت کی حالت میں ادا ہو سکتی ہے۔ اسلام کی نشاطِ ثانیہ کا زمانہ قریب ہے۔ اسی جانب فقر کا رجوع ہے۔ پاکستان سے چاٹنا تک سارے علاقہ میں اسلام کی حیات ہوتی ہے۔

☆...☆...☆